درس نظامی چند مباحث

محمد دین جوہر

محمد دین جوہر صاحب ایک پختہ کار لکھاری اور صاحبِ فکر ونظر ہیں، انہوں نے درس نظامی پر اٹھنے والے بعض سوالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو جوابات تحریر کئے وہ ایک طویل مضمون کی صورت اختیار کر گئے، ذیل میں ہم ان کے خیالات اختصار کے ساتھ پیش کرنے کی جسارت کر رہے ہیں..... جوہر صاحب کے خیالات مدارس کے علماء ومنتظمین کی توجہ کے مستحق ہیں، ان کی کسی رائے سے کسی کو اختلاف ہو تو مجلہ فقہ اسلامی متبادل نکتہ نظر و آراء کو قبول کرے گا..... ہمارے خیال میں انہوں نے مدارس کے نصاب پر وارد ہونے والے اعتراضات کی خوبصورت و مدلل انداز میں دفاع کی کوشش کی ہے۔ہم نے بعض سطور کو خط کشیدہ بنا دیا ہے کہ ان کے الفاظ قابل توجہ ہیں۔(مجلس ادارت)

یہ امر پیش نظر رہنا چاہئے کہ درس نظامی پر ہماری گفتگو میں تعلیم اپنے نظری اور عملی پہلوؤں سے زیر بحث ہے اور مذہب پر گفتگو اس سے خارج ہے۔آغاز ہی میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ درس نظامی کی عمومی حمایت اور اس کی بنیاد نہ کوئی ''فرقہ ورانہ وابستگی'' یا ''سیاسی وفاداری'' ہے اور اس کا تعلق کسی تعلیمی یا تہذیبی شعور سے نہیں ہے۔یہ حمایت خاص تاریخی حالات میں ایک ضروری ردعمل کے طور پر سامنے آئی تھی۔لیکن ردعمل کا مسئلہ یہ ہے کہ معترض فکر سے باخبر ہوتا ہے اور نہ اس سے مخاطب اور مخالف قوت کے مساوی کوئی عمل سامنے لانے کی سکت بھی نہیں رکھتا۔''ردعمل'' کا نتیجہ اپنی فکر اور عمل کی بتدریج کمزوری اور بال آخر خاتمہ ہے۔اس کی بڑی وجہ ردعمل کا خود آگہی سے خالی ہونا ہے۔رد کے برعکس، ردعمل کو فکری کمک بھی حاصل نہیں ہوتی اس لیے یہ بہت جلد ہانپ کر ختم ہو جاتا ہے اور متبادل فکر اور عمل کے لئے راستہ صاف ہو جاتا ہے۔درس نظامی پر گذشتہ دو سو سال میں ہونے والے اعتراضات اور ان سے جنم لینے والے شکوک وشبہات اب خود ان لوگوں میں مؤثر ہو گئے ہیں جو اس کے حامی یا وارث ہیں۔اس لئے انہیں خود درس نظامی کے کسی

☆ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا سن ولادت ۸۰ ہجری اور سن وفات ۱۵۰ ہجری ہے ☆

''مناسب بندوبست'' کی بہت جلدی ہے۔

درس نظامی میں ردوبدل اعتراضات کے ساتھ ہی شروع ہوگیا تھا۔ وقت کے ساتھ داخلی طور پر درس نظامی میں تبدیلیاں لائی جاتی رہیں اوران تبدیلیوں کی وجہ سے یہ اپنی اصلی حالت میں ویسے بھی باقی نہیں رہا۔ یہ تبدیلیاں عموماً داخلی تقاضوں کا نتیجہ تھیں۔ یہ تبدیلیاں کیوں لائی گئیں ان کے مقاصد کیا تھے پس پردہ فکر کیا تھی اور ان کا کیا نتیجہ سامنے آیا؟ منتشر معلومات کے علاوہ ان تبدیلیوں پر کسی مربوط محاکے سے میں واقف نہیں ہوں۔ لیکن ان تبدیلیوں سے درس نظامی داخلی طور پر بھی سنگین مسائل کا شکار ہوگیا اور ''عصری تقاضوں'' کا دباؤ بھی کم نہ ہوسکا۔ درس نظامی کی افادیت اب چونکہ اپنے شعبے میں بھی ظاہر نہیں ہورہی اس لئے مذہبی طبقات اس میں خود ہی تبدیلی یا ریڈیکل تبدیلی لارہے ہیں۔ اور یہ تبدیلی حالات کے دباؤ میں ''تجربات'' کا سلسلہ ہے کسی تجزیاتی فکر پر بننے والا منصوبہ نہیں ہے۔ اس کا بہت سادہ مطلب یہ ہے کہ معترضین ٹھیک ہی کہتے آئے ہیں اور مذہبی لوگوں نے بھی تسلیم کرلیا ہے کہ موجودہ ثقافتی معاشی اور سیاسی دباؤ میں درس نظامی کا علی حالہ باقی رکھنا مفید نہیں۔ لیکن ان تبدیلیوں کا اصل مقصد ومطلب درس نظامی کا خاتمہ ہی ہے۔

اس میں کوئی بحث نہیں کہ درس نظامی ''عصری تقاضوں'' کے مطابق نہیں ہے اور اس پر اعتراض اور تبدیلی کا مطالبہ بھی اسی بنیاد پر کیا گیا ہے۔ لیکن آمد استعمار کے ساتھ عین یہی اعتراض خود اسلام پر بھی وارد ہوتا آیا ہے۔ سرسید اور متجددین کے بنا کردہ ''جدید اسلام'' کا بنیادی موقف یہی تھا کہ مذہب کو عصری تقاضوں کے مطابق ہونا چاہئے اور درس نظامی پر زیادہ تر اعتراضات بھی اسی حلقے سے سامنے آئے ہیں۔ گزارش ہے کہ درس نظامی پر گفتگو کا درست تناظر عصری تقاضوں کی بجائے بطور مسلمان ہماری چند مستقل ضروریات ہیں مستقل ضروریات میں وقت کے ساتھ کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ عصری تقاضوں کا بیانیہ اب اس قدر مضبوط ہوگیا ہے کہ ان مستقل ضرورتوں پر بات کرنا بھی ممکن نہیں رہا۔ دینی روایت مستقل ضرورتوں اور عصری تقاضوں سے درس نظامی کا تعلق الگ الگ زیر بحث آنا چاہئے۔

بطور مسلمان یہ مستقل ضروریات دینی بھی ہیں اور تہذیبی بھی۔ درس نظامی ضروری ابتدائی تعلیم درکار تعلیمی نظام اور مطلوبہ تدریس کی تین اہم شرائط پر ان کو بہ تمام وکمال پورا کرنے کی استعداد رکھتا ہے۔ لیکن ان مستقل ضروریات کا کوئی بیان چونکہ موجود نہیں ہے اس لئے درس نظامی کی

گفتگو میں ہر قدم مداہنت کا ہے اور ہر گھڑی شکست کی ہے۔ چونکہ دین اب ہمارے سر کا تاج نہیں رہا بلکہ ہمارے پاؤں کی زنجیر بن گئی ہے۔ اس لئے ہم عصری تقاضوں کی آڑ میں اسے کاٹنے کے لئے بڑے بڑے پاپڑ بیل رہے ہیں۔ درس نظامی میں کی جانے والی تبدیلیاں انتہائی پست درجہ سکولوں کی پست ترین نقل اور نقالی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ آڑ جان چھرانے کے لئے ہوتی ہے اور عصری تقاضے پورے کرنے کے لئے زندہ ذہن اور مضبوط ارادے کی ضرورت ہوتی ہے۔

عرض ہے کہ تعلیم اور علم سے ہمعصریت کو بے دخل نہیں کیا جاسکتا۔ درس نظامی سے ہمعصریت یا عصری تقاضوں کا تعلق فی نفسہ نصاب کا مسئلہ نہیں ہے اس کی praxis کا ہے۔ praxis سے ہماری مراد ایسے عمل کی ہے جو کسی قدر یا تحقق کے لئے بروئے کار لایا جائے۔ کوئی بھی praxis ہمعصریت سے خالی نہیں ہوسکتی۔ درس نظامی کے ساتھ جڑی ہوئی ہماری روایتی praxis کی زبوں حالی سے ہمعصریت کا مسئلہ پیدا ہوا ہے۔ ہماری مذہبی praxis کی کمزوری اور تہذیبی افکار سے انقطاع کا نتیجہ یہ نکلا کہ درس نظامی عصری تقاضوں کے مہلک دباؤ کا شکار ہوگیا اور بہت جلد سرسید کی تعلیم کی طرح روزگار کا ذریعہ بن گیا۔ یہ عصری تقاضوں سے انہی شرائط پر ہم آہنگی ہے۔ تعلیم روزگار کے لئے بھی ہوتی ہے لیکن مسلمانوں کا موقف یہ رہا ہے کہ صرف روزگار کے لئے نہیں ہوتی۔ اب عصری تقاضوں کی بات درس نظامی کی بنیاد پر روزگار کے امکانات کو بہتر بنانے کے لئے ہورہی ہے یا استعماری قوتوں کے ڈسکورس کو تقویت دینے کے لئے اس کے خاتمے کی تجویز زیر غور ہے۔ روزگار کے امکانات بہتر بنانے کے لئے درس نظامی کو بدلنا بہت زیادہ مضرات رکھتا ہے۔ اگر عصری تقاضوں کا معروضی تجزیہ کیا جائے یا ان لوگوں ہی سے پوچھ لیا جائے جن کا اوڑھنا بچھونا عصری تقاضے ہی ہیں تو یہی نتیجہ نکلے گا کہ مدرسے کو ختم کرکے اس کی جگہ اسکول بنا دینا زیادہ انسانی اور دیانتدارانہ فیصلہ ہوگا۔

سوال: میرے محترم عرض یہ ہے کہ مرحوم درس نظامی پر بہت سے اعتراضوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس میں نحو کی کتب جو داخل نصاب ہیں جیسے ہدایۃ النحو کافیہ اور خاص کر شرح ملا جامی وغیرہ وہ ایسے ذہن کی غمازی کرتی ہیں جو بال کی کھال اتارنے کا بہت شوق رکھتا ہے اور جو بہت ہی فضول ذہنی ورزش کا ذوق رکھتا ہے۔

جواب: گزارش ہے کہ اعتراض ایک عام چیز ہے اور کوئی بھی کرسکتا ہے۔ لیکن کسی بھی شعبے پر اس کے متعلقین اور ماہرین کی طرف سے آنے والا اعتراض ثقہ اور معتبر ہوتا ہے اور اس کے جواب

میں فکراور عملی حکمت کے وسائل بروئے کارلانے کی وجہ سے مفید بھی ہوتا ہے۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ معترض درس نظامی کے پیچھے کارفرما تصور تعلیم سے بے خبر ہے' بلکہ یہ کہ وہ کسی تصور تعلیم سے باخبر نہیں۔ ہر ظاہری کام پر تنقید اس کے عملی اور نظری پہلوؤں کو شامل ہوتی ہے۔ درس نظامی کے تحت واقع ہونے والا تعلیمی عمل جامعاتی تھا جو عملی اور نظری پہلوؤں کو لئے ہوئے تھا۔ ایک وقت تھا کہ اس کے مقاصد جن کی حیثیت اب نظری ہے بدیہی تھے اور اس تعلیمی عمل سے حاصل ہوتے تھے۔ تاریخی حالات کے بدلنے سے ان کا استحضار جاتا رہا' اور جب ان مقاصد کے مرتب اور مبسوط بیان کی ضرورت پڑی تو وہ فراہم نہ ہوسکا۔ ان مقاصد کا حصول اب بدیہی تجربے اور مشاہدے سے بھی نہیں ہے' اور ان کا کوئی نظری بیان بھی موجود نہیں ہے۔ درس نظامی کی نظری تغلیط بھی اب تک مکمل ہوچکی ہے' اور اب جو باقی ماندہ تعلیمی عمل ہے وہ از خود مہمل نظر آنے لگا ہے۔

اگر لسانی مباحث کا تعلق اہم چیزوں مثلاً انسان کے اعتقادی حقائق یا بنیادی اقدار سے ہو تو بال کی کھال معمولی چیز ہے' اس میں تو بال کی کھال کے خلیے بھی ادھیڑنے پڑتے ہیں۔ ذہنی ادراک واظہار کی صلاحیت اور اس میں کمال' جزئیات اور تفصیل میں جائے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ یہ بات صرف درس نظامی کے حوالے سے نہیں کہی جارہی بلکہ علی الاطلاق ہے۔ تعلیم میں یہ ایک فطری اور لابدی امر ہے اور ہر طرح کی تعلیم میں ضروری طور پر شامل ہے۔ جدید سائنس آج nanoprecision کے بغیر ناقابل تصور ہے' اور یہی حال اس کے نظری مباحث کا ہے۔ یہ صورت حال اس لئے ہے کہ جدید سائنسی تعلیم نے اپنے بنیادی قضایا کے تعاقب میں پہلے بال اکھیڑا' پھر اس کی کھال ادھیڑی' پھر کھال کی کھال اور جسد بال کو ادھیڑا' پھر خلیہ کی کھال ادھیڑی' پھر خلیے کے اندر پرزے کھولے' پھر ان پرزوں میں مالیکیول کو کان سے پکڑ کر لا حاضر کیا' پھر ایٹم کی باری آئی' اور وہاں تک پہنچے جہاں اب ادھیڑنے کے لئے کچھ بھی نہیں۔ سکنات اور حرکات کا ایک پورا نظام اس عمل میں الگ سے ساتھ ساتھ ہے۔ یہ ہنر ہے' عیب نہیں کیوں کہ سائنس شے مرکز ہے اور شے کی تعلیم اور علم اس بات کا تقاضا کرتا ہے۔ ہماری روایت میں لفظ کی اہمیت بنیادی ہے۔ اور اگر لفظ کے مباحث ضروری طور پر مفصل اور ادق ہوجائیں تو کیا یہ عیب بن جاتا ہے؟ یہ درست ہے کہ بال کی کھال اتارنے کا کام مواعظ اور روزمرہ زندگی میں قطعی غیر ضروری بلکہ مضر ہے' لیکن تعلیم اور علم میں ضروری ہے۔

گزارش ہے کہ تعلیمی عمل کا مقصد اور فوکس بنیادی طور اجزا ہوتے ہیں' اور علم کلیات کے بغیر ناقابل

☆ امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت سن ۹۳ ہجری میں اور وفات ۱۷۹ ہجری میں ہوئی ☆

تصور ہے۔تعلیم میں حاصل شدہ جز،علم کے کل سے جڑ کر بامعنی ہوجاتا ہے۔اگر طالب علم کے پاس جزئیات کا علم نہ ہوتو وہ علم کی دہلیز پر رک جاتا ہے کیونکہ وہ کلیات کا علم حاصل کرنے کے لئے ضروری اور مطلوب استعداد سے ابھی بہرہ ور نہیں ہوتا۔جس چیز کو معترض بال کی کھال کہہ رہا ہے وہ یہی جزیات کی تعلیم ہے۔جو ذہن جز سے اوبھ گیا ہو وہ کل کا سامنا نہیں کرسکتا۔

انسانی ذہن کی فکری تربیت اور مذہبی شخصیت کی تشکیل کے مطالبات کو پیش نظر رکھتے ہوئے درس نظامی نے تعلیمی مقاصد کے حصول کے تمام مسائل فراہم کئے تھے۔لیکن ہم ان کو محفوظ نہ رکھ سکے۔درس نظامی کو جدید اور عصر حاضر کے مطابق بنانے کا جو منصوبہ ہے اس کی بنیاد جہالت اور بددیانتی ہے اور کچھ نہیں ہے۔اس منصوبے میں یہ کوشش داخل ہے کہ اہم اور بحث طلب امور کی طرف دھیان نہ جانے پائے۔

محولہ بالا اعتراض اس لئے لغو ہے کہ جز کی توبات کرتا ہے اور اس جز کو معنی دینے والے کل کو فراموش کردیتا ہے۔اس کل کی فراموشگاری سے ہمارے اجزا بھی بے معنی ہوکر رہ گئے ہیں۔کل کی فراموشگاری میں بال کی کھال ادھیڑنا بالکل معیوب ہے،لیکن کل اور جز کی متعازیت میں یہ امر مطلوب ہے۔یہ تو کمال کی بات تھی،اور چونکہ عیب اور ہنر کا شعور ہی ختم ہوکر رہ گیا ہے،اس لئے ہمارے ہنر اگر کہیں باقی ہیں تو عیب ہی شمار ہوتے ہیں۔یہ اسی تعلیم کا اثر تھا کہ آج سے سو دو سو سال پہلے جو کتابیں لکھی گئیں،وہ اپنے فنی کمال میں بھی حیرت انگیز تھیں۔آج معجزہ ہائے ہنر اگر ظاہر نہیں ہوتے تو بلاسبب نہیں۔

سوال:جس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ مثلاً ایک نحوی عبارت الکلمۃ لفظ وضع لمعنی مفرد پر بلا مبالغہ صوبہ پنجاب کے عالم مدارس میں کئی دنوں تک سبق ہوتا ہے،بلکہ بعض اوقات ایک مکمل ہفتہ استاد کی تقاریر،اور اگر صوبہ خیبر پختون خواہ یا بلوچستان اور بعض اور علاقوں میں بھی ایک ہفتہ سے زیادہ۔

جواب:یہ اعتراض نصاب پر نہیں طریقہ تدریس پر ہے اور اس کی نوعیت بنیادی طور پر ایک اخلاقی مسئلہ کی ہے۔درس نظامی سے جڑی ہوئی ہماری دینی اور تہذیبی praxis کے خاتمے سے یہ مسائل پیدا ہوئے ہیں۔درس نظامی تقوی،مکارم اخلاق اور معاشرتی آداب کی رسومیات میں واقع ہونے والا تدریسی عمل تھا۔

میں یہاں تقوی،مکارم اخلاق اور معاشرتی رسومیات کا ذکر نہیں کرتا،لیکن یہ ضرور پوچھنا چاہوں گا کہ ناقص تدریسی،بدانتظامی،تعلیمی عمل سے بے خبری اور جدید تعلیمی عمل کی پست ترین نقالی کس دینی ضرورت

کو پورا کرتی ہے؟ حضرت نور محمد حقاؒ اپنے نورانی قاعدے کے مینول کی پہلی تختی میں فرماتے ہیں:

جب تک اتنی مشق نہ ہو آگے نہ پڑھائیں۔ ورنہ وہی مثل صادق آئے گی' آ گا دوڑ پیچھا چوڑ۔ اگر کوشش اور محنت سے پڑھا نہیں سکتے تو ناحق بچوں کی عمر اور استعداد برباد نہ کریں۔ اس کا گناہ چوری اور رہزنی سے بھی بدتر ہے۔ کیوں کہ مال واسباب پھر بھی مل سکتا ہے' لیکن گزری ہوئی عمر واپس نہیں آ سکتی' اور بگڑی ہوئی استعداد درست نہیں ہوتی۔ (صفحہ نمبر ۶' نورانی قاعدہ مع طریقہ تعلیم' مؤلفہ حضرت مولانا نور محمد حقانیؒ' دار الفکر' اردو بازار' لاہور' پاکستان)

اب ذرا اس قول کی روشنی میں غریب سکولوں اور درس نظامی کی تدریس کو دیکھنے کی کوشش کریں تو ذہن سن ہو جائے گا اور آنکھیں پتھرا جائیں گی۔

اب یہی فقرہ لیجئے جو آپ نے لکھا ہے۔ عین اسی فقرے پر چند ایک سوالات اور مدرسین کی قطعی لاعلمی میرے مشاہدے میں ہے۔ ان کو تو خود پتہ نہیں ہوتا کہ اس فقرے کی مراد اور اس کے توسیعی امکانات کیا ہیں؟ تو وہ اگر سال بھر پڑھاتے رہیں تو کیا فرق پڑے گا؟ یہیں سے لفظ ومعنی کی بحث کا آغاز ہوتا ہے۔

یہ لفظ اور معنی کی ایک نسبت کا بیان ہے۔ آپ نے آگے چل کر خود ہی کہا ہے کہ اس تدریس یا ایسی تدریس کے بعد طالب علم تو اپنی روایت میں عین اسی ڈسپلن کی کوئی کتاب پڑھنے کے قابل نہیں ہوتا۔ اس سے ایک چیز مبرہن ہوگئی کہ اس اعتراض کا درس نظامی کے نصاب سے کوئی تعلق نہیں' بلکہ عمل تدریس اور انتظام تدریس سے ہے۔ اور یہی وہ طریقہ تدریس ہے جس کی بدولت روایت بھی ہاتھ سے جاتی رہی اور جدیدیت کا شعور بھی پیدا نہ ہوا۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ درس نظامی کو جدید بنانے کی بات تو ہر کوئی کرتا ہے۔ لیکن جدید تدریسیات (modern pedagogay) نے جو تعلیمی وسائل پیدا کئے ہیں اور جن کی حیثیت گھوڑے کی بجائے کار میں سفر کرنے جیسی ہیں' ان کی بات کوئی نہیں کرتا۔ جدید تدریسیات کے نئے وسائل انتخاب کے بعد بخوبی درس نظامی کی تدریس میں شامل کئے جا سکتے ہیں۔ آپ کا ذکر کردہ مسئلہ بنیادی طور پر اخلاقی اور ضمناً پیشہ ورانہ ہے اور اسے کوئی بھی زیر بحث نہیں لانا چاہتا۔

درس نظامی پر جتنی بھی گفتگو ہوتی ہے اس میں واحد موضوع نصاب اور اس کی تبدیلی ہے۔ تبدیلی کی اس تجویز کو بہتری' عصری ضرورت وغیرہ کے عنوان سے متعارف کرایا جاتا ہے۔ کچھ اس کے حامی

ہیں اور کچھ مخالف۔اس بحث میں ضروری پہلوؤں کا بیان کوئی جگہ نہیں لے پاتا' اور جو فوراً مذہبی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ہم فرض کر لیتے ہیں کہ مدارس میں درس نظامی کی جگہ اکسفر ڈ کا نصاب لگا دیا جائے اور باقی چیزوں کو علی حالہ رہنے دیا جائے' یعنی تعلیمی نظام' بچے کی عمر اور اس کی ذہنی نمو کے مسائل 'طریقہ تدریس۔آموزش اور امتحان کے جاری طریقہ کار کو نہ چھیڑا جائے تو کیا نتائج ہوں گے؟ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ اس سے کیا بہتری آئے گی اور کون سی چیز بہتر ہوگی؟ ہم اسی سوال کو الٹ دیتے ہیں کہ کسی جدید سکول کے نصاب کو چھیڑے بغیر اس کا تعلیمی انتظام' تدریس آموزش اور امتحان وغیرہ مدارس کی طرز پر بنا دیا جائے تو کیا نتائج نکلیں گے؟ اس پر کوئی غور کرنے کے لئے تیار نہیں۔اس لئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ درس نظامی پر ساری گفتگو میں دیانتداری اور انسانی ذمہ داری کا قطعی فقدان ہے۔

سوال: چونکہ طالب علم پر برصغیر کی قدیم تدریسی روایت کے مطابق کتاب کے حل کرنے پر زیادہ زور لگایا جاتا ہے' اور بے ضرورت احتمالات کو نکال نکال کر زور لگایا جاتا ہے جس سے مقصود اصلی یعنی کتاب کا حل کہیں اور ہی رہ جاتے ہیں' اور طالب علموں کو ذہنی کوفت الگ ہے۔

جواب: بھائی صرف بستہ باقی ہے اور اب اسی کا بندوبست ہو رہا ہے۔یہ بات محل نظر ہے کہ ہمارے ہاں برصغیر کی قدیم تدریسی روایت کے مطابق جیسی کوئی چیز موجود ہے۔میں اس اعتراض کو درست نہیں سمجھتا۔ایسی کوئی شے موجود نہیں ہے۔

لیکن اگر کچھ کہنا ضروری ہے تو عرض ہے کہ یہ اعتراض بھی تدریس پر ہی ہے۔آج کل متن کی تدریس میں ciose reading خود ایک آرٹ ہے۔ہم چونکہ اس سے بے خبر ہیں اس لئے اس طرح کے اعتراضات پیدا ہوتے ہیں۔ہمارے ہاں مطالعہ متن کی روایت anaesthesia کی حالت میں جاری ہے۔اسے اس حالت سے باہر لانے کی ضرورت ہے۔متن کی تدریس روزمرہ تجہیز اور تکفین کا عمل بن گیا ہے۔اور جو طویل عرصے سے جاری ہے۔معترض مطالبہ کر رہا ہے کہ اس عمل کو پورا کرو' اور اب عمل تجہیز و تکفین کرنے والے بھی تدفین کے قائل ہو گئے ہیں۔یہ کوئی نہیں کہتا کہ متن تفہیم' تنمو اور تزئین کا مطالبہ رکھتا ہے کیونکہ یہ بات کسی کو اچھی نہیں لگتی۔

درس نظامی کا اندازہ آج کل اس کے فارغ لوگوں کو دیکھ کر نہیں لگانا چاہئے۔اس نصاب کو اس کی اپنی شرائط اور اس کے اپنے تناظر میں سمجھ کر کوئی critique سامنے آنی چاہئے اور جدید نصاب سے اس کا موازنہ ہونا چاہئے۔ہمیں نہ تنقید کا خوف ہے اور نہ موازنے پر اعتراض ہے۔لیکن اعتراض موضوع

سے متعلق ہونا چاہئے ۔ہاں یہ اعتراض تو ہوسکتا ہے اور ہونا بھی چاہئے کہ ہم نے درس نظامی کو anaesthesia machine کیوں بنادیا ہے؟ یہ کارنامہ ہم نے تدریس اور امتحان کی اخلاقی بنیادوں کو ختم کر کے سرانجام دیا ہے۔

یہاں ضمناً اس امر کی یاددہانی ضروری ہے کہ سرسید نے جدید تعلیم سے کوئی تہذیبی مسئلہ حل نہیں کیا تھا' بلکہ ان کی آوردہ تعلیم سیاسی طاقت کی غلام گردشوں کا گرد باد اور معاش مرکز تھی۔ جب محکوم مسلم معاشرے میں روٹی ہی مقصد تہذیب اور حاصل حیات بن گئی تو اس کا اثر مدارس پر بھی پڑا اور وہاں بھی مقاصد اور طریقہ کار میں تغیر آنے لگا۔اس سے ہمیں بحث نہیں کہ مدارس میں بہت خرابیاں ہیں' کیوں کہ ہر انسانی عمل نارسائی کا شکار رہتا ہے۔لیکن اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ مدارس نے انتہائی محدود وسائل اور شدید تہذیبی اور ثقافتی دباؤ میں جس کام کو جاری رکھا وہ غیر معمولی ہے۔ ہم مدارس سے perpetual sacrfice کا مطالبہ قطعی ناجائز سمجھتے ہیں۔ ہمارے معاشرے نے جدید تعلیم پر جو وسائل خرچ کئے ہیں اور جو نتائج اس وقت سامنے ہیں' ان کا اگر مدارس سے موازنہ کیا جائے تو مدارس کی قربانیوں کا درست اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔مدارس کی موجودہ صورت حال کی ذمہ داری صرف مدارس پر عائد نہیں کی جاسکتی' ہمارا پورا معاشرہ اس کا ذمہ دار ہے۔

سوال: اور حواشی پر زور اتنا زیادہ دیا جاتا ہے متن کا حل کہیں دور جا پڑتا ہے مثلاً اصول الفقہ کی ایک کتاب ہے التوضیح والتلویح' اس کتاب میں خود التنقیح تین کتب کا خلاصہ ہے اور پھر اس کی شرح جو مصنف نے خود کی ہے یعنی التوضیح' پھر اس پر علامہ تفتازانی کا حاشیہ اور پھر مزید ایک اور حاشیہ آج کل کی درسی کتب کی زینت ہے اور اس پر بحث ایسی کہ التوضیح کا متن کئی دنوں بعد پڑھنا نصیب ہوتا ہے۔

جواب: یہ سوال بھی التباس کا شکار ہے اور اصلاً تدریسی انتظام (academic management) کے ناکارہ پن اور اس کے مضرات کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ مسائل ہماری تدریسی نارسائی سے پیدا ہوئے ہیں۔اس سے یہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ تدریس اور تدریسی ترتیب میں سنگین مسائل پیدا ہوگئے ہیں۔جدید تدریسیات میں نصابی کتاب سازی کا تدریس سے براہ راست تعلق ہے۔تدریس میں تدریسی مواد' طریقہ تدریس' بچے کی عمر کا تعین از حد ضروری ہے ''مذہبی' مذہبی'' کا غلغلہ اس قدر ہے کہ ایسی باتیں سننے کے لئے بھی تیار نہیں کیونکہ اس سے تدریسی کام کا طریقہ اور اس کی کوالٹی زیر بحث آتی ہے جس سے ردعمل پیدا ہوتا ہے۔

ایک اور بڑا مسئلہ تعلیم اور علم کے فرق کو نہ سمجھنے کی ضد سے پیدا ہوا ہے۔ درس نظامی دینی تعلیم کا نصاب نہیں ہے، دینی علوم کے حاصل کرنے کا نصاب ہے۔ دینی تعلیم ہر مسلمان کی ضرورت اور اس پر فرض ہے، لیکن دینی علوم ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے اور نہ ضرورت، اور نہ ہر مسلمان اس کی اہلیت رکھتا ہے۔ دینی تعلیم ہدایت کی تعلیم ہے جو دعا ہے اور دینی علوم عام نہیں خاص ہیں۔ یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ مدرسہ تعلیم کی جگہ ہے اور جامعہ علم کا گھر ہے۔ ہم نے یہ فرق بالکل ہی مٹادیا ہے۔ درس نظامی اصلاً یونیورسٹی کے نصاب جیسا ہی جس کے لئے ابتدائی تعلیم کی شرائط لازمی اہمیت کی حامل ہیں۔ تمثیلاً عرض ہے کہ ہم یونیورسٹی کا نصاب سکول کے بچوں کو پڑھا رہے ہیں۔ میں اس امر کا براہ راست مشاہدہ رکھتا ہوں کہ جس طالب علم کی استعداد پنجم یا ششم کا عام نصاب پڑھنے کی بھی نہیں ہے، اسے یونیورسٹی کا نصاب پڑھایا جارہا ہے۔ اس سے کون سا مقصد پورا ہوتا ہے؟

بطور ایک عام مقلد میری اپنی تعلیم کی بنیادی ضروریات "تعلیم الاسلام" پڑھ کر پوری ہو جاتی ہیں اور میں دین کے مطابق زندگی کی استعداد پیدا کر لیتا ہوں۔ لیکن اگر کہا جائے کہ یہ دینی تعلیم، دینی علوم کی سیڑھی بھی بن گئی تو انتہائی افسوس ناک ہوگا۔ دینی تعلیم اور دینی علوم کے امتیاز کو باقی رکھنا درس نظامی پر گفتگو کے لئے ضروری شرط ہے۔ دینی علوم کے حصول کے لئے دینی تعلیم قطعی غیر متعلق چیز ہے۔ دینی تعلیم کا براہ راست تعلق عقائد، عبادات اور سنن مبارکہ سکھانے کرانے سے ہے اور یہ مقصد کئی طریقوں سے حاصل ہو سکتا ہے۔ صرف ونحو، لفظ و معنی کی بحث، جزئی اور کلی کے مسائل، متون کی خواندگی کا اعلیٰ معیار، افکار کی پیچیدہ حرکیات دینی تعلیم میں قطعی عبث، غیر ضروری اور مضر ہیں، لیکن دینی علوم میں مثلاً اصول دین، اصول الفقہ وغیرہ میں یہ شرط اول ہیں۔ مثلاً کلام الٰہی ہماری زندگی اور موت کا مسئلہ ہے اور اگر اس میں لفظ و معنی کی بحث چھڑ جائے، اور فرض کیا کہ اس میں باطنی موقف غالب آجائے تو کیا صورت حال پیدا ہو جائے گی؟ ابھی میں نے افلاطون اور ارسطو کا ذکر نہیں کیا۔ یہ بحث بالکل بھی دینی نہیں ہے۔ لیکن اس کے نتائج براہ راست دینی ہیں۔ تقوی ضروری چیز ہے لیکن اس بحث سے غیر متعلق ہے۔ ہم نے فرض کر لیا ہے کہ دنیا میں اب باطنی بھی نہیں رہے، اور افلاطون اور ارسطو بھی مر مرا گئے ہیں، علوم کی ضرورت بھی ختم ہوگئی ہے، اہل مغرب قرآن مجید کی غواصی سے سائنس بنا چکے ہیں، اور ان کا معاشرہ بھی قرآنی منشور کو سامنے رکھ کر بنایا گیا ہے، لہذا اب عصری ضرورت کے ذمہ داریوں کی تقسیم ہو چکی ہے اور میرے حصے میں صرف تیسیر ہی آئی ہے، اور اسی کی کوشش ہونی چاہئے۔

حد یعمل فی الارض خیر لاهل الارض من ان یمطروا اربعین صباحا (الحدیث)

موقع کی مناسبت سے ایک اہم بات کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔تعلیم میں سیکولر اور مذہبی کا فرق بہت اہمیت رکھتا ہے اور اس فرق کو ملحوظ رکھنا ہماری دینی ضرورت ہے۔دینی تعلیم مقصود بالذات ہے کیوں کہ اس کے مشمولات دینی ہیں اور غیر مبدل ہیں۔مثلاً عقائد‘عبادات‘مکارم اخلاق وغیرہ کی تعلیم مقصود بالذات ہے ورنہ ہمارے مسلمان ہونے کا کوئی معنی باقی نہیں رہتا۔جب کہ نظری علوم مقصود بالذات نہیں ہوتے‘محض ایک ذریعہ ہیں اور نہایت ضروری ذریعہ ہیں۔تعلیم ہمیشہ مانعاتی (exclusionary) اصولوں پر قائم ہوتی ہے‘اور علم ہمیشہ جامعاتی (inclusionary) اصولوں پر تشکیل پاتا ہے۔یعنی مسلمانوں کی تعلیم کی شرائط باقی مذہب وملت کے لوگوں سے بہت کچھ مختلف ہوں گی‘جبکہ حصول علم کے وسائل اور ذرائع باقی انسانیت کے ساتھ مشترک ہوں گے۔تعلیم کا اصول عموم اشتراک نہیں ہے‘جبکہ علم بنیادی شرط ہی عموم اشتراک ہے۔دینی تعلیم میں عصری تقاضوں کا مسئلہ بصیرت اور احتیاط کا متقاضی ہے‘اور علم میں لابدی ضرورت ہے۔

اگرچہ بات طویل ہوگئی لیکن ایک اور ضروری بات کا موقع بھی یہی ہے۔جدید تعلیم کے برعکس‘مذہبی تعلیم میں تدریس اور تذکیر دونوں شامل ہوتے ہیں۔تدریس کی بنیاد تفہیم ہے‘جبکہ تذکیر کی بنیاد حافظہ ہے۔

دینی تعلیم میں حافظہ کو مرکزیت دی جاتی ہے‘جب کہ جدید تعلیم میں تفہیم کو اولیت حاصل ہے۔یہ اجمالی بات ہے‘اس کی تفصیل میں تذکیر اور تفہیم پر کرنے کی اور بہت ضروری باتیں ہیں۔آپ بخوبی واقف ہیں کہ تذکیر ہمارے لئے کس قدر اہم ہے۔کلمے‘نماز‘دعائیں‘اذکار وغیرہ اولاً سمجھنے کے لئے نہیں‘یاد کرنے اور عمل کرنے کے لئے ہے۔یہ بات ہم غیر مذہبی متون کے بارے میں نہیں کہہ سکتے۔اس پر تفصیل سے پھر کسی موقع پر عرض کروں گا‘لیکن ان کی بنیاد پر تعلیمی حکمت عملی اور ترتیب بنانا کچھ مشکل نہیں ہے۔

سوال: علوم عقلی کا ذوق ایسا غالب کہ منطق کی تقریباً ۱۵ کتب ہوتی ہیں اور فلسفہ کی تقریباً کوئی ۱۰ کے قریب کتب اوران پر کم ازکم حواشی مستزاد کہ معاملہ ایک چیستاں کو حل کرنے سے کم نہیں۔اور مزید یہ کہ انداز تدریس ایسا گنجلک کہ ایک متوسط کے لئے بہت ہی تنگی۔اور یہ کہ علوم عقلی سے ایسے متاثر کہ اگر کوئی عقلی علوم میں کوئی خاص مہارت نہیں رکھتا اگرچہ فن حدیث سے خوب واقف تو بھی اس کی تدریس کم مشہور اور حلقہ تدریس بھی بہت کم۔

جواب: درس نظامی میں منطق اور فلسفہ کی کتابیں اس لئے شامل کی گئی تھیں کہ پورا تعلیمی عمل متوازن

بناتی ہیں۔لیکن دونوں سطحوں پر درس نظامی سخت محنت اور جگر کاوی کا لازمی مطالبہ رکھتا ہے۔

سوال: مزید یہ کہ جب قافلہ نئے فلسفے سے ہے تو قدیم فلسفے کو پڑھاتے ہوئے وقت کو گزارنا کون سا مناسب فعل ہے؟ آخر اب جدید فلسفہ کے مقابلے میں مثلاً زمانے کے قدیم ہونے یا عذاب قبر کے ہونے یا اعمال کا جزو ایمان ہونے نہ ہونے سے کیا تعلق ہے؟ اب درس نظامی میں جو بھی عقیدے کی کتاب ہے قدیم فلسفے سے لبریز ہے۔کم از کم ان کے ساتھ جدید فلسفہ کے رد کے لئے بھی کوئی نہ کوئی انتظام ہونا چاہئے ناں؟

جواب: انتظام تو بھائی کافی سارے ہونے چاہییں لیکن کرے کون؟ اس میں سوال یہ ہے کہ کیا اہل فلسفہ جدید قدیم فلسفہ سے دستبردار ہو گئے ہیں؟ اور کیا آج بھی جدید یونانی فلسفے کے بغیر فلسفہ کوئی معنی رکھتا ہے؟ فلسفہ تو دور کی بات ہے جدید ادبی تھیوری پر بھی کوئی گفتگو یونانی فلسفے سے آگہی کے بغیر ممکن نہیں۔دوسری گزارش یہ ہے کہ مقابلے کی خام خیالی سے ہمیں باہر آنا چاہئے ہمارے حالات اتنے ناگفتہ بہ ہیں کہ ہمیں نہ میدان کا پتہ معلوم ہے نہ میدان میں اترنے کی ضروریات کا کوئی ادراک ہے نہ اس بات کا کہ وہاں کیا گھمسان برپا ہے نہ اس بات کا کہ ہم میدان کے اندر ہیں یا باہر۔ہم تو آج کے میدانوں کے تماشائی جیسا شعور بھی نہیں رکھتے۔مقابلے کی بات محض خود فریبی ہے۔ہمیں یہ ادراک ہونا چاہئے کہ یہ مقابلہ کب کا ہمارے خلاف فیصل ہو چکا ہے۔اس کی وجہ ہماری نااہلی ہے کوئی اور نہیں ہے۔

ایمان اور عمل صالح کے لئے مذہبی آدمی کو فلسفے یا مابعد الطبیعیاتی علوم کی قطعی کوئی ضرورت نہیں۔لیکن مذہبی آدمی کو فلسفے سے اعتنا کی ضرورت دو وجوہات سے پڑتی ہے۔ایک یہ کہ دنیا ایسی چیزوں سے خالی نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے جو نہ صرف ایمان نما ہیں بلکہ اکثر اوقات ایمان کی جگہ لے لیتی ہیں۔ہر وقت موجود اس خطرے سے بچاؤ کے لئے عقیدے کا خود آگاہ اور خود نگر ہونا لازم ہے۔نظری یا فلسفیانہ ہونے کا یہی مطلب ہے۔دوسری وجہ زیادہ اہم ہے کہ قرن اول کے تدوینی دور میں روایت کے مختلف شعبوں میں اصول سازی کی ضرورت پیش آئی جو ایک نظری سرگرمی ہے اسی باعث اصول سازی فلسفیانہ طریقہ کار سے جزوی مشابہت اور مماثلت رکھتی ہے۔

مختصر ایہ کہ ہماری دینی روایت میں مختلف علوم جس اصول پر قائم ہوئے ہیں وہ ہدایت سے متصادم نہیں بلکہ اس کے ضمن میں ہیں۔جدید علوم میں اول اصولوں کی حیثیت اصول محض کی ہے۔مثلاً فزکس کا اصل اصول بگ بینگ ہے حیاتیات میں نظریہ ارتقا ہے اور نفسیات میں لاشعور ہے اور ان سب کی

بناتی ہیں۔لیکن دونوں سطحوں پر درس نظامی سخت محنت اور جگر کاوی کالازمی مطالبہ رکھتا ہے۔

سوال: مزید یہ کہ جب قافلہ نئے فلسفے سے ہے تو قدیم فلسفے کو پڑھاتے ہوئے وقت کوگزارنا کون سامناسب فعل ہے؟ آخراب جدید فلسفہ کے مقابلے میں مثلاً زمانے کے قدیم ہونے یا عذاب قبر کے ہونے یا اعمال کا جزو ایمان ہونے نہ ہونے سے کیا تعلق ہے؟اب درس نظامی میں جو بھی عقیدے کی کتاب ہے قدیم فلسفے سے لبریز ہے۔کم ازکم ان کے ساتھ جدید فلسفہ کے رد کے لئے بھی کوئی نہ کوئی انتظام ہونا چاہئے ناں؟

جواب: انتظام تو بھائی کافی سارے ہونے چاہییں لیکن کرے کون؟اس میں سوال یہ ہے کہ کیا اہل فلسفہ جدید قدیم فلسفہ سے دستبردار ہوگئے ہیں؟اور کیا آج بھی جدید یونانی فلسفے کے بغیر فلسفہ کوئی معنی رکھتا ہے؟فلسفہ تو دور کی بات ہے جدید ادبی تھیوری پر بھی کوئی گفتگو یونانی فلسفے سے آگہی کے بغیر ممکن نہیں۔دوسری گزارش یہ ہے کہ مقابلے کی خام خیالی سے ہمیں باہر آنا چاہئے ہمارے حالات اتنے ناگفتہ بہ ہیں کہ ہمیں نہ میدان کا پتہ معلوم ہے نہ میدان میں اترنے کی ضروریات کا کوئی ادراک ہے نہ اس بات کا کہ وہاں کیا گھمسان برپا ہے نہ اس بات کا کہ ہم میدان کے اندر ہیں یا باہر۔ہم تو آج کے میدانوں کے تماشائی جیسا شعور بھی نہیں رکھتے۔مقابلے کی بات محض خودفریبی ہے۔ہمیں یہ ادراک ہونا چاہئے کہ یہ مقابلہ کب کا ہمارے خلاف فیصل ہو چکا ہے۔اس کی وجہ ہماری نااہلی ہے کوئی اور نہیں ہے۔

ایمان اور عمل صالح کے لئے مذہبی آدمی کو فلسفے یا مابعد الطبیعیاتی علوم کی قطعی کوئی ضرورت نہیں۔لیکن مذہبی آدمی کو فلسفے سے اعتنا کی ضرورت دو وجوہات سے پڑتی ہے۔ایک یہ کہ دنیا ایسی چیزوں سے خالی نہیں ہے اور نہ ہوسکتی ہے جو نہ صرف ایمان نما ہیں بلکہ اکثر اوقات ایمان کی جگہ لے لیتی ہیں۔ہر وقت موجود اس خطرے سے بچاؤ کے لئے عقیدے کا خود آگاہ اور خودنگر ہونا لازم ہے۔نظری یا فلسفیانہ ہونے کا یہی مطلب ہے۔دوسری وجہ زیادہ اہم ہے کہ قرن اول کے تدوینی دور میں روایت کے مختلف شعبوں میں اصول سازی کی ضرورت پیش آئی جو ایک نظری سرگرمی ہے اسی باعث اصول سازی فلسفیانہ طریقہ کار سے جزوی مشابہت اور مماثلت رکھتی ہے۔

مختصراً یہ کہ ہماری دینی روایت میں مختلف علوم جس اصول پر قائم ہوئے ہیں وہ ہدایت سے متصادم نہیں بلکہ اس کے ضمن میں ہیں۔جدید علوم میں اول اصولوں کی حیثیت اصول محض کی ہے۔مثلاً فزکس کا اصل اصول بگ بینگ ہے حیاتیات میں نظریہ ارتقا ہے اور نفسیات میں لاشعور ہے اور ان سب کی

حیثیت اصول محض(principle/theory pure) کی ہے'اوران میں سے کوئی بھی rational نہیں ہے۔ان کے ضمن میں جوبھی اصول تشکیل دیئے گئے ہیں ان کی کل معنویت انہی اصولوں سے اخذ ہوتی ہے'مثلاً بگ بینگ کا اصول یہ فرض کرتا ہے کہ مادہ یا کائنات خودبخود وجود میں آئی ہے۔اب اس اصول پر قائم ہونے والا علم اوراس کے تحت واقع ہونے والی عقلی کارگزاری جوآخری نتیجہ اخذ کرتی ہے وہ بھی یہی ہوتا ہے کہ کائنات خودبخود وجود میں آئی ہے کسی شعبہ علم میں اصول اول قائم کرنا انسانی شعور کی نہ صرف ضرورت ہے بلکہ عقل کی فعلیت کے لئے ضروری ہے۔اصول محض کی حیثیت دراصل ایک وجودی اصول کی ہے اور عقل اس سے آگے سفر نہیں کرتی اور نہ کرسکتی ہے۔لیکن یہ اصول اول ضروری نہیں کہ اصول محض ہو۔اصول محض عقیدے سے مشابہ اورمتوازی ہے'اورعقل کا گھر بھی ہے اورمنزل بھی۔جدید علوم میں کسی بنیادی علمی ڈسپلن کا تصور اصول محض کے بغیر ممکن نہیں۔اصول سازی کا عمل انسان کی وجودی اورعلمی آٹونومی کا مظہر ہے۔دینی روایت میں بھی اصول سازی ایک ضروری امر ہے لیکن اس میں ضروری امتیازات صرف اسی صورت میں باقی رکھے جاسکتے ہیں جب ہمیں نظری علوم سے بھی کوئی مضبوط نسبت پیدا ہوچکی ہو۔

اہم بات یہ ہے کہ ہماری تہذیبی روایت میں فلسفہ اپنی پورائی میں حملہ آور ہوکر شکست کھاچکا ہے۔یہ بات ایک تاریخی واقعہ کے طور پر ظاہر ہوچکی ہے'اس کا مطلب کیا ہے؟اس کا مطلب صرف ایک ہی ہے کہ اب دنیا میں مذہبی ہونے کا اسلامی کے علاوہ کوئی اورمطلب نہیں ہے کیوں کہ فلسفہ اوراس کے متولد براہ راست یا بالواسطہ باقی تہذیبوں کی غیرمادی اورمذہبی اساس کوختم کرچکے ہیں۔کیا ہم کسی کو یہ مطلب بتانے کی ضروری تیاری اوراس کے لئے مطلوبہ اعتماد رکھتے ہیں؟دوسرا مسئلہ یہ ہوا ہے کہ فلسفہ نے وجود کے سوال سے دستبردار ہوکر اسلامیج تہذیب کی اس strategic کامیابی کوغیراہم بنادیا'اورایک tactical brilliiance کوکام میں لاتے ہوئے اس کامیابی کے نشانات بھی مٹادیئے۔وجودی سوالات سے دستبرداری کے بعد جدید علم کے حق کی دریافت جیسے دعوے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔لیکن اس بنیادی تبدیلی سے فلسفہ اورجدید علم'فطرت کے ان وسائل تک رسائی پانے میں کامیاب ہوگئے جوطاقت اورسرمائے کے حصول کا ذریعہ ہیں۔

نظری سرگرمی یا فلسفیانہ علوم آج کی دنیا کو سمجھنے اوراس میں راستہ بنانے کے لئے ایک ضرورت کی حیثیت رکھتے ہیں۔جدید عہد میں اجتماعی زندگی کا ہرشعبہ نظام کی ساخت پرقائم

ہوا ہے۔سیاسی، معاشی، تعلیمی، ابلاغیاتی، عسکری اور ٹیکنالوجی کے نظام وغیرہ قائم ہونے کی وجہ سے علت ومعلول کا بدیہی اور حسی سلسلہ ختم ہوگیا ہے۔اور چیزوں اور واقعات کی باہمی نسبتیں اب نظری ہوگئی ہیں۔نظری علم اور نظام جڑواں ہیں۔ہمارے ہاں نظری بحث کا خاتمہ ہوگیا ہے اور نظام کا شوق بڑھ گیا ہے، اور یہ شوق بہت خطرناک ہے۔اسلامی نظام کا شوق بھی اوروں کی کوئی چیز دیکھ کر پیدا ہوا ہے، کسی نظری شعور کا ثمر نہیں ہے۔

سوال: کیا جدید دور کے تقاضوں اور جدیدیت سے متاثر ذہن کو مدنظر رکھتے ہوئے نظام تعلیم، تدریس اور نصاب میں تبدیلی نہیں لانی چاہئے؟

جواب: اصولاً تو اس سوال کا جواب اثبات میں ہے۔لیکن یہ اتنا سادہ معاملہ نہیں جتنا کہ اس سوال میں ظاہر کیا جارہا ہے۔اس لئے یہ سوال نہیں، جواب ہے۔مثلاً جدید دور کے تقاضے بدل گئے ہیں، جدیدیت کے غلبے سے ذہن متاثر ہیں، یعنی دین سے دور ہورہے ہیں۔اس کا سبب نیا نظام تعلیم، جدید تدریسی اور نئے نصابات ہیں۔درس نظامی ان کے مطابق نہیں وغیرہ وغیرہ۔

میں نے عرض کیا تھا کہ اب صرف بستہ باقی ہے، اسی کا بندوبست ہورہا ہے۔آپ جس نظام تعلیم، تدریس اور نصاب کو بدلنے کی بات کررہے ہیں وہ کہاں ہے اور کون سا ہے، اور اس کا بیان کیا ہے؟

تبدیلی ایک صورت حال سے دوسری صورت حال کی طرف ارادی پیش رفت کا نام ہے۔اور اس پیش رفت کی سمت موجود اور مطلوب صورت حال کے مفصل نظری نقشے پر مشتمل ہوتی ہے۔ان تفصیلات اور ضروری ارادے کے بغیر عصری تقاضوں کا بلڈوزر سب کچھ ویسے ہی صاف کردیتا ہے، اسے ہماری معاونت کی ضرورت نہیں ہوتی۔

سوال: یہ ہے کہ درس نظامی میں اکثر بلکہ تقریباً تمام کتب متاخرین کی ہیں، متقدمین کی کوئی کتاب شامل نصاب نہیں۔حالانکہ متقدمین کی کتب ان سے بہتر ہیں۔علم وفضل ان کا مقدم، تہذیب اور صاحب شریعت کے دور سے زیادہ قربت، اس کے ساتھ علمی شعور، معنویت متاخرین کی بنسبت زیادہ اور اس کے ساتھ سادہ طرز بیان۔دوسری بات یہ ہے کہ ایسی مشکل نہیں کہ بغیر شروح وحواشی کے حل نہ ہوں۔

جواب: یہاں درس نظامی ایک نصاب کے طور پر زیر بحث ہے۔متقدمین کے زہد وتقوی اور عظمت کردار سے کسے انکار ہے؟ متقدمین کے نمونے اور فضائل ہماری پیروی اور محبت کے لئے ہیں، نصابی کتب کے انتخاب کا معیار بالکل نہیں ہیں۔متاخرین کی کتب نصاب میں شامل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ پوری

دینی اور علمی روایت تک رسائی کے وسائل فراہم ہوجائیں اور تاریخی سفر میں جو فنی پہلو علمی روایت کا لازمی حصہ بن جاتے ہیں ان میں بھی ضروری تربیت ہوجائے۔ درس نظامی کا مقصد ہی متقدمین سے زندہ تعلق کو باقی رکھنا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ درس نظامی کی کتابیں متاخرین کی ہیں یا متقدمین کی اس میں جس ضرورت کو سامنے رکھا گیا اور اس کے حصول کے جو ذرائع اختیار کئے گئے وہ غیر معمولی ہیں۔ ہر علمی روایت وقت کے ساتھ فطرتاً اور ضرورتاً ٹیکنیکل ہوجاتی ہے اور یہ کوئی عیب نہیں خوبی ہے۔ متقدمین اور متاخرین میں اس طرح کے غیر ضروری موازنے زیادہ مفید نہیں ہوتے۔

سوال: یہ بات بھی کہ خود درس نظامی کے ساتھ ساتھ ہمارے پرانے نصاب میں ایک تو مشکل کتب اس کے ساتھ انتہائی دقیق اور کئی جگہ تو بہت مختصر متون شامل کئے گئے۔ تو کیا نصاب میں آسان مگر جامع کتب نہیں رکھی جاسکتیں؟ جس سے طلبا پر بوجھ بہت زیادہ نہ پڑے۔ اور اگر یوں کہا جائے کہ انتہائی دقیق کتب لکھ کر ان کی آسانی کے لئے کتب حواشی سے بھر دی گئیں اور مزید اس کے لئے شروحات لکھ دی گئیں۔ تو کیا ایسی ہی کتب کیوں نہ لکھ دی گئیں تو اگرچہ بہت زیادہ نہیں تو درمیانی حد تک آسان کتب نصاب کے لئے لکھ دی جاتیں۔ اگر طالب علم سے دقت مطلوب ہوتی تو اتنا شروح اور حواشی کی بھرمار چہ معنی دارد؟

جواب: جدید تعلیم اور علوم میں رہتے ہوئے اگر مشکل اور آسان کی حیثیت معلوم ہوجائے تو یہ بحث بھی فیصل ہوجاتی ہے۔ ہمارے ہاں آسان آسان کا جو شعور ہے وہ کسی اخلاقی، دینی یا علمی ضرورت سے پیدا نہیں ہوا بلکہ ہمارے ذہن کی شکست کا اظہار ہے۔ زیادہ سخت لیکن درست تر بات یہ ہے کہ ایسے مطالبات ہمارے ذہن کے خاتمے کا اظہار ہیں۔ تیسیر کے مطالبات اس لحاظ سے درست ہیں کہ جب ذہن ہی ختم ہوگیا تو ذہن سے متعلق چیزوں کا باقی رکھنا کیا ضرور ہے؟ اس مطالبے کی ایک وجہ اور وجہ تعلیم اور علم کے امتیازات کو ارادی طور پر نظر انداز کرنا اور ان کے وجود سے انکار کرنا ہے۔ تہذیبی ذہن کی نمو میں پیچیدگی ایک لازم عنصر کے طور پر شامل ہوتی ہے۔

(جاری ہے)۔۔۔